نگارشات متعلق شمسؔ

ماخوذ از کتاب مولانا سید محمد باقر شمسؔ شخصیت وفن مرتبۂ جناب حسین انجم صاحب، پاکستان

(۱) محققِ یگانہ

مولوی سید قائم مہدی نقوی سؔاحر اجتہادی، پاکستان

خاندانِ اجتہاد برِّ صغیر کا وہ مشہور ومعروف علمی خانوادہ ہے، جس نے اتنی بڑی تعداد میں جید علماء اور اعلیٰ پایہ کے ادباء وشعراء پیدا کئے جتنے شاید برصغیر کے تمام علمی اور ادبی خانوادوں نے مل کے بھی نہیں پیدا کئے ہوں گے ان میں علماء ایسے کہ علمائے عراق وایران ان کو احترام کی نظر سے دیکھتے اور ادبا وشعرا ایسے جو شعر وادب کا اعتبار بنے ۔ مرثیہ گوئی میں لکھنؤ کے جن چار خاندانوں کی اہمیت تسلیم کی گئی ان میں خاندانِ انیس، خاندانِ دبیر اور خاندانِ تعشق کے ساتھ خاندانِ اجتہاد بھی شامل ہے۔ اگر صرف خاندانِ اجتہاد کی خدمات اور علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آجائے گی۔

خاندانِ اجتہاد کی ان علمی اور ادبی خدمات کا سلسلہ بارھویں صدی ہجری کے آخر سے اب تک جاری ہے۔ انقلاباتِ وقت اور امتدادِ زمانہ سے اس خاندان کے بہت سے مقتدر حضرات وقتاً فوقتاً لکھنؤ سے ہجرت کرکے برِ صغیر کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔ چند حضرات نے عراق وایران میں بھی سکونت اختیار کی، خاص طور پر پاکستان بننے کے بعد ہجرت کا یہ عمل ایک عمومی سیلاب کی صورت میں سامنے آیا۔ جس میں اس خاندان کے بھی بہت سے بزرگ اور نوجوان شامل تھے ۔ انھوں نے پاکستان آکر یہاں بھی علمی اور ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبانِ کمال ہونے کے باوجود ان حضرات کا یہاں کی علمی اور ادبی دنیا میں کوئی خاص چرچا نہیں ہوا اور نہ عوام کی اکثریت ان سے واقف ہے۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ یہ حضرات عام روش کے خلاف کسی قسم کے نام ونمود کے خواہشمند نہ تھے۔ نہ انھوں نے اپنے نام کے جھنڈے اپنے ہاتھوں سے بلند کرنے کی رسم کو پسند کیا، نہ اپنے گلے میں ڈھول لٹکا کر اپنے نام کا ڈنکا پیٹنے کی کوشش کی۔ وہ گوشہ نشین رہ کر خاموشی سے ٹھوس کام کرنے کو ترجیح دیتے رہے۔ بدقسمتی سے آج کل جو نمودِ ذات (Self-Projection) کے لئے باقاعدہ Lobbying (اپنے ہواخواہوں کے ذریعہ لوگوں پر اثر انداز ہونا)، گروہ بندیاں، تحسین باہمی کی امدادی انجمنیں اور اپنے آپ کو خود ''استاد'' تسلیم کرنے اور تسلیم کروانے کے دوسرے طریقے اختیار کرنے کی روایت میں شدت آگئی ہے، اس کو وہ حضرات اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے خلاف سمجھتے تھے اور خاکساری اور انکساری کو اپنا طرۂ امتیاز جانتے تھے۔ نہ ان کی کوئی Lobby تھی، نہ انھوں نے کوئی گروہ بنائے تھے، نہ ذاتی پروپیگنڈہ ان کے مزاج سے لگاؤ کھاتا تھا اور نہ بےجا ذاتی افتخار سے ان کو کوئی کام تھا۔ خصوصاً وہ حضرات جو عالمِ دین ہوئے، عام ادبی محفلوں، مشاعروں وغیرہ میں شرکت کو اپنے وقار کے منافی سمجھتے تھے، حالانکہ وہ اگر ایسی محفلوں میں شریک ہوتے تو نہ جانے کتنے ہی بزعم خود (جید) اور استاد قسم کے ادیبوں اور شاعروں کے چراغ گل ہوجاتے۔

ایسی ہی مقتدر ہستیوں میں محققِ یگانہ جناب مولانا سید محمد باقر شمسؔ کی ذاتِ گرامی بھی شامل ہے ۔ وہ ایک بہت بڑے عالمِ دین کے فرزند ہیں اور خود علم دین کے ایک معتبر عالم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کے والد گرامی اعلم العلماء جناب سید

سبطِ حسین وہ عالم تھے، جنھوں نے دس، پندرہ سال تک عراق کے دینی مرکز میں درس خارج دیا اور سرزمین دجلہ وفرات پر اپنے علم کے دریا بہاتے رہے۔ برصغیر میں ان کو ایک اعلم کا درجہ دیا جاتا تھا اور بعض علمائے عراق وایران بھی ان کی اس حیثیت کے معترف تھے۔

مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب خود نہ صرف ایک عالمِ دین ہیں، بلکہ نہایت بلند پایہ ادیب اور نہایت خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ وہ ان اہلِ قلم میں سے ہیں، جن کے قلم سے علم وادب کے ایسے غنچے پھوٹے ہیں، جنھوں نے ایک بہارستان سجادیا ہے۔ وہ کئی نہایت اہم کتابوں کے مصنف ہیں، جن کے مختلف النوع موضوعات میں تحقیق، تاریخ، تہذیب، تنقید، زبان ولسانیات، شعروادب وغیرہ، سبھی کچھ شامل ہیں۔ وہ عمر کے مختلف ادوار میں بڑے بڑے علمائے ادب کے ہم جلیس وہم بزم رہے ہیں۔ بعض جہتوں سے وہ ان میں امتیازِ خاص بھی رکھتے ہیں۔ ان حضرات میں ''امراؤ جان ادا'' کے شہرۂ آفاق مصنف مرزا محمد ہادی رسوا، اردو کے ممتاز ترین قصیدہ نگار اور جوشؔ ملیح آبادی کے استاد مرزا محمد ہادی عزیزؔ، خود حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی، ممتاز علمی شخصیت اور مرثیہ پر اپنے وقت کی سب سے بڑی سند، یعنی پروفیسر مسعود الحسن ادیب، بلند پایہ ادیب وصحافی شیخ ممتاز حسین، 'فرہنگِ اثر'' کے مصنف، ممتاز شاعر اور مستند اہل زبان مرزا جعفر علی خاں اثرؔ، اپنے وقت کے نہایت خوش فکر شاعر اور بلند پایہ قصیدہ نگار مرزا کاظم حسین محشرؔ، موقر شاعر وعظیم نظم نگار، لسان العصر صفی لکھنوی، نہایت وقیع تنقید نگار اور دانشور ڈاکٹر احسن فاروقی، اردو کو ایک نئے رنگِ نگارش سے آشنا کرنے والے اور اس میں ایک نئی روح پھونک دینے والے نہایت مقتدر ادیب ونقاد نیاز فتحپوری اور ان کے علاوہ بھی متعدد قدآور علمی وادبی شخصیات شامل ہیں۔ ان حضرات کی صحبت میں جناب محمد باقر شمسؔ صاحب نے علم وادب کی بہت سی کلیاں چنیں اور بہت سے پھول لٹائے بھی۔

جناب محمد باقر شمسؔ صاحب مدظلہ کی شخصیت بہت پہلودار ہے۔ ان کے فضل وکمال کا اظہار کئی جہتوں سے ہوتا ہے۔ ان کے اشہبِ قلم کی جولانیاں کسی ایک میدان تک محدود نہیں ہیں۔ ان کے طائرِ فکر کی اڑان کے لئے فضا بہت وسیع و بسیط ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، وہ عالم دین بھی ہیں، ادیب بھی، شاعر بھی، نقاد بھی، مورخ بھی، محقق بھی، ان کے علاوہ بھی ان کی شخصیت کے اور پہلو ہیں۔ اگر ان سب پر گفتگو کی جائے تو نہ صرف یہ کہ مضمون بہت طویل ہوجائے گا، بلکہ لکھنے والے کا بھرم بھی کھل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی علمی وادبی قد کو ناپنے والا اگر خود اتنی قامت نہیں رکھتا کہ اونچی ایڑیاں کر کے اور پنجوں کے بل کھڑے ہوکر بھی اس بلندی تک نہ پہنچ سکے تو اس کا بھرم تو کھلنا ہی ہے، اس لئے میں نہایت مختصر طور پر مولانائے موصوف کی علمی وادبی شخصیت کے محض چند پہلوؤں پر طالبعلمانہ نظر ڈالوں گا اور اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کروں گا۔

جناب شمسؔ صاحب قبلہ کو جس سب سے اہم شخصیت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، وہ برِصغیر میں اس دور کے سب سے بڑے مجتہد اور عظیم عالمِ دین سید العلماء جناب مولانا سید علی نقوی النقوی عرف مولوی نقن صاحب کی ذاتِ گرامی تھی۔ سید العلماء سے جناب شمسؔ صاحب کی محض خاندانی قرابت ہی نہیں تھی، بلکہ بچپن ہی سے دوستی کا بہت مضبوط رشتہ قائم تھا، اسی لئے جب تک دونوں لکھنؤ میں رہے، ان کا ہمہ وقت کا ساتھ تھا۔ سید العلماء ان لوگوں میں سے نہیں تھے، جو ذاتی قرابت یا دوستی کی بنا پر بغیر استحقاق کے کسی کے علمی مرتبہ کی تعریف کرتے۔ وہ علم کے مرتبہ کو پہچاننے والے اور جوہر شناس نظر رکھنے والے تھے۔ دوستی یا قرابت کے پاس ولحاظ سے کسی معمولی استعداد کے شخص کو عالم کہہ دینا یا عام معیار کے ادیب کو بلند مرتبہ عطا کردینا، ان کی شان کے خلاف تھا۔ ان کے پایہ کے عالم سے یہ توقع رکھنا سوءِ ظن ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ جناب سید العلماء نے شمسؔ صاحب کو ''محققِ یگانہ'' کا لقب دیا تو اس کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ جناب شمسؔ صاحب نے تاریخ تہذیب

اور زبان پر اتنا تحقیقی کام کیا، جس سے متاثر ہوکر جناب سید العلماء طاب ثراہ نے ان کو ''محقق یگانہ'' کے لقب سے نوازا۔ ''نگارشاتِ رنگ رنگ'' کے پیش لفظ میں حسین انجم صاحب نے سید العلماء کی اس تحریر کا عکس شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے شمس صاحب کو ''محققِ یگانہ'' سید محمد باقر شمس لکھا ہے اس سے تحقیق کے میدان میں ان کے مرتبہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کے تحقیقی کام کے سلسلہ میں ان کی تصنیف ''تاریخ لکھنؤ'' کا مطالعہ دلچسپ اور اہم ہوگا۔

مولانائے موصوف بحیثیت ماہر زبان اپنا جواب نہیں رکھتے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان کی صحت، محاورں کا صحیح استعمال، تذکیر و تانیث کا مسئلہ، لفظوں کا صحیح تلفظ، متروکاتِ زبان، لفظوں کے معانی و مفاہیم میں نازک سے فرق، ان کے مزاج اور محلِ استعمال کے اعتبار سے لفظوں کا فصیح وغیر فصیح ہونا اور اسی طرح صنائع و بدائع کا مکمل علم، یہ سب اور زبان سے متعلق جو بھی رموز و نکات ہیں، ان پر مولانا کی بڑی گہری نظر ہے۔ ان کو زبان کی کسوٹی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے ''لکھنؤ کی زبان'' کے موضوع پر اسی نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جو ایک نہایت اہم تصنیف ہے۔

خود احتسابی ایسی اعلیٰ انسانی صفت ہے، جو انسان کو اس کی سیرت و کردار کے نکھارنے اور سنوارنے میں ہر قسم کی تعلیم و تربیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جناب شمسؔ میں خود احتسابی کا جذبہ شدت سے کارفرما ہے۔ شاعری کے میدان میں خصوصاً ایک سے ایک بے شعور شاعری کے گلے پر چھری چلاتے ہوئے بزعم خود اپنے آپ کو صرف استاد ہی نہیں سمجھتا، بلکہ خود کو میرؔ و غالبؔ کے ہم پلہ سمجھتا ہے۔ ایک غزل کا ایک شعر سننے میں آیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

کہہ دو میرؔ و غالبؔ سے، ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمھاری تھی، یہ صدی ہماری ہے

غزل اچھی تھی۔ ایک آدھ شعر تو رنگِ جدید میں واقعی بہت اچھا تھا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں ''سخن گسترانہ'' بات آپڑی ہے ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں''، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح کبھی کبھی ایک نوزائیدہ سیاستداں اس میدان میں قدم رکھتے ہی اپنے آپ کو ایک بڑا قومی لیڈر اور منبر کے زینہ پر پہلا قدم رکھتے ہی کوئی مقرر ''علامہ'' بن جاتا ہے، اسی طرح مشقِ سخن کا آغاز کرتے ہی بعض شعرائے کرام خود کو رشک عرفی، فخر طالب، اسداللہ خان غالبؔ سمجھنے لگتے ہیں۔

مولانا محمد باقر شمسؔ شعر گوئی کا نہایت قوی ملکہ اور شعر فہمی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں بہت سے زندہ رہنے والے اشعار مل جائیں گے۔ ان کی شاعری فکر وفن (دونوں) کا دلکش مرقع ہے، مگر انھوں نے شاعری کو ایک مستقل مشغلہ کے طور پر اختیار نہیں کیا، بلکہ ایک طرح شاعری سے دست کش ہوگئے۔ حسین انجم صاحب نے مولانا کی کتاب ''نگارشاتِ رنگ رنگ'' کے تعارف میں اس کا سبب انہیں کے لفظوں میں اس طرح لکھا ہے:

''بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں برسوں حضوری کا شرف حاصل رہا، ان کی قدرتِ بیانی، تازگیِ مضمون، محاسن شعریہ اور مصرع لگانے میں فنکاری اور کمال کو سمجھا، اس کے بعد اپنے کلام کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میرے اشعار کی بندش چست اور درست ہے، ادائے مطلب پر قادر ہوں، عروض و قافیہ، معانی و بیان اور زبان و محاورہ کی کوئی غلطی نہیں، مگر پامال مضامین کو فرسودہ طریقہ پر نظم کرتا ہوں۔۔۔کوئی تازگی نہیں، کوئی انفرادیت نہیں۔ اپنے کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ میں نے فوراً شعر کہنا چھوڑ دیا۔''

(کچھ اپنے بارے میں از شعور و شاعری، صفحہ ۱۵۷)

مندرجہ بالا اقتباس درج کرنے کے بعد حسین

انجم صاحب نے کیا خوب لکھا ہے:

''اگر اس جذبۂ خود احتسابی اور حقیقت پسندی کی ذرا سی رمق دوسرے حضرات میں بھی پیدا ہو جائے تو دنیائے شعر ان جملہ مزخرفات سے محفوظ ہو جائے گی، جو آئے دن شعر کے نام پر کہے، پڑھے اور چھاپے جاتے ہیں۔(نگارشاتِ رنگ رنگ۔۔۔فٹ نوٹ صفحہ ۸۶)

جدید تنقید نے شعر کے فکری عنصر کو اپنا مرکزِ نظر بنایا اور فنی عنصر کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ فکری اعتبار سے شاعری نے ترقی کی ہے یا نہیں، اس سے فی الحال بحث نہیں، مگر فنی اعتبار سے شاعری یقینا تباہ ہو گئی ہے۔ اس بات سے کوئی صاحب نظر اور فن شناس انکار نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ایسے اعلیٰ پایہ کے ادیب و نقاد نے فنی تنقید، جس کو بعض حضرات لفظی تنقید بھی کہتے ہیں، کو نظر انداز کر دینے کے نتائج کی پیشگوئی کرتے ہوئے مولانا محمد باقر شمس صاحب قبلہ کی تصنیف ''شعور و شاعری'' کے پیش لفظ میں یہ لکھا تھا:

''شعور و شاعری میں فن کے ان اٹل دائمی اور بنیادی اصولوں کے تحت مختلف قسم کی شاعری کو پرکھا گیا ہے، جن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے، بغاوت بھی کی جا سکتی ہے، مگر جنہیں فراموش کر دینے سے شاعری کا اپنی راہ سے ہٹ کر برباد ہو جانا لازمی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا مندرجہ بالا پیش لفظ ۱۵ دسمبر، ۱۹۷۴ء کا لکھا ہوا ہے، اس کو سترہ برس گذر گئے۔ اس عرصہ میں فنی اعتبار سے شاعری کا جو حال ہوا ہے، اس کو بربادی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

آج کل بڑے بڑے، سکہ بند اور ملک گیر شہرت رکھنے والے شاعر ''ہمارا'' اور ''تمھارا'' کے ساتھ ''نعرہ'' اور ''فائدہ'' کے ساتھ ''قاعدہ'' کو قافیہ بناتے ہیں اور دھڑلے سے پڑھتے ہیں۔ زبان کا تو ذکر ہی کیا، یہ غریب تو اب ہر ایک کے گھر کی لونڈی بن گئی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ زبان سے اف نہیں کر سکتے، ورنہ قدامت پرستی دقیانوسیت اور لکیر کے فقیر ہونے کے طعنوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے گی۔

ہر طرح کی فنی بے راہروی کو فن کی معراج سمجھ لیا گیا ہے۔ بعض بزعمِ خود ''مجتہدین سخن'' یہ کہہ کے زبان بند کر دیتے ہیں کہ انھوں نے یوں کہا ہے اور اس میں کیا شک کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا کہ ''اس''، ''ہم''، اور ''میں'' کے پس پردہ ادعائے اجتہاد ہے۔۔۔ گویا میدان تقریر کی ''علائیت'' بزمِ سخن میں بھی داخل ہو گئی ہے

انہیں حقائق کو دیکھتے ہوئے چند برس پیشتر ٹی وی کے ایک مذاکرہ میں اردو کے معروف اور نہایت معتبر ادیب و نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم (سابق صدر اردو صوبۂ بلوچستان یونیورسٹی) نے بھی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ فنی اور لفظی تنقید پر دوبارہ توجہ دینا چاہیئے۔

جناب مولانا محمد باقر شمس صاحب مدظلہ کی گرانقدر تصنیف ''شعور و شاعری'' تنقید کی اسی شاخ پر کھلا ہوا ایسا پھول ہے، جس کی خوشبو ہر اس شاعر، نقاد اور اہل نظر کے مشام جاں کو معطر کرتی رہے گی، جو خود پسندی کے زکام میں مبتلا نہ ہو۔ اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے ایک ایک جملہ سے ان کے شعور و شاعری، ژرف نگاہی، نکتہ رسی، وسعتِ نظر اور فن پر مضبوط گرفت کا اندازہ ہو جائے گا۔

شعر پر اصلاح دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو فن کا ٹھوس علم ہو، شعر فہمی کا اعلیٰ مذاق اور فکر کا بھر پور شعور رکھتا ہو۔ ان خوبیوں کے بغیر شعر پر اصلاح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر فن کا علم نہ ہو تو عروض و قافیہ، بندش اور نشستِ الفاظ اور اسی طرح دوسری خامیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ شعر فہمی کا اعلیٰ مذاق نہ ہو یا فکر کا بھر پور شعور نہ ہو تو شعر کو سمجھنا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا ممکن ہی نہیں۔ پھر اگر لفظی اور معنوی

خامیوں کو سمجھ بھی لے اور خود اعلیٰ پایہ کا شاعر نہ ہو تو ان خامیوں کو دور کر کے اس طرح اصلاح دینا کہ شعر اصل سے بلند ہو جائے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اصلاح کیا، جس کے بعد شعر لفظی اور معنوی طور پر اصل سے بہتر نہ ہو جائے۔

''شعور وشاعری'' میں شعر وشاعری کے متعلق صرف فنی بحثیں ہی نہیں ہیں، بلکہ مولانا نے مشہور شعرا کے کلام پر اصلاحیں بھی دی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ کسی بڑے نام سے مرعوب ہوئے بغیر جس طرح انہوں نے انیسؔ، غالبؔ اور فیضؔ ایسے شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور ان پر اصلاحات دی ہیں، وہ کسی معمولی صلاحیتوں کے شاعر، نقاد اور استاد کے بس کی بات نہیں۔ اصلاح دینا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے، جس کے کلام پر چاہے، اصلاح دے۔ (یہاں اصلاح سے میری مراد ردوبدل ہے) دیکھنا تو یہ ہے کہ اصلاح کے بعد شعر کا حشر کیا ہوا۔ کیا شعر اصلاح کے بعد بلند یا بلند تر ہو گیا یا اصلاح دینے والے نے اس کی مٹی پلید کر دی۔

جناب شمسؔ صاحب قبلہ پہلے ہر شعر کے اسقام پر بحث کرتے ہیں، پھر اس کو اصلاح دے کر فنی اور معنوی (دونوں) اعتبار سے اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ اگر شاعر خود دیکھے تو اپنے عجز کا اعتراف کئے بغیر اور ان کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر میرا جی کی نظم ''جوئبار'' کو لیجئے۔ اس کے ہر ہر مصرع پر ان کی بحث، اس کا تجزیہ اور پھر اس پر اصلاح، دیکھنے کی چیز ہے۔ اسی طرح ماہر القادری کی نظم، غالبؔ کے شعر پر نیازؔ فتحپوری کی دی ہوئی اصلاح پر اصلاح اور جگر کے اشعار کا تجزیہ اور ان پر اصلاح ۔۔۔ غرض یہ کہ ''شعور وشاعری'' کا جو مضمون بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ شعر کیسے سمجھا جاتا ہے، کیسے اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور کیسے اس کو اصلاح دے کر بلند کر دیا جاتا ہے۔ اس فن میں مولانائے موصوف کی مہارت حیرت انگیز ہے۔

میں اسے اپنی بدنصیبی کہوں یا اپنی زندگی کا المیہ کہوں کہ مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب کی اس صفت، یعنی اصلاحِ شعر میں ان کی مہارت، کا علم مجھ کو اب ہوا، جب وقت تقریباً گذر چکا ہے۔ کاش میں نے پاکستان آنے کے بعد ہی ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہوتا اور ان کے فیوضِ شعری سے فیضیاب ہوتا تو شاعری میں آج میں جس مقام پر ہوں، اس سے یقیناً کہیں بلند مقام پر کھڑا ہوتا!



(۲) ہمہ جہت شخصیت

جناب اظہار حیدر صاحب ایڈوکیٹ، پاکستان

امید ہے کہ آپ کی صحت بھی اپنی اسی حالت پر، جس کو انگریزی میں States quo کہتے ہیں، ہوگی۔ یہی بہت غنیمت ہے، ورنہ آجکل ہم سب ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ کیا پتہ کس وقت کس کی سہ حرفی اطلاع اخبار میں شائع ہو جائے۔ میری صحت کی بھی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ یوں سمجھئے کہ نہ جانے کتنی بار قضا کا دامن ہاتھ میں آتے آتے چھوٹ گیا۔ بہرحال زندگی کے کام تو آخر دم تک چلتے ہی رہتے ہیں۔

اس وقت رات کے تین بجے کا عمل ہے۔ آنکھ کھل گئی۔ آپ کی ادبی شخصیت کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرنا بھی ایک فرض سمجھتا ہوں، جس کو اپنے تمام محدودات کے باوجود پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہرحال خواہ ناکام ہی کوشش کیوں نہ ہو، اپنے ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کر رہا ہوں۔ آپ میرے مزاج سے بخوبی واقف ہیں کہ میں اپنے ضمیر کی عدالت میں صفائی کے گواہ پیش کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ یقین جانئے اگر یہ چند سطریں، جو آپ کے ایسے عظیم المرتبت عالم اور ادیب کے لئے ناکافی ہیں، نہ تحریر کرتا تو ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہتا۔

میں نے آپ کی تصنیف وتالیف کردہ ساری کتابوں کا بغور مطالعہ کیا، اور بالخصوص ادبی کتابوں کے مطالعہ سے آپ کی

ناقدانہ صلاحیت کا قائل ہونا پڑا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میرا صحیح معنوں میں آپ سے تعارف پہلے کیوں نہیں ہوا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ایک ملک فتح کرنا یا دریافت کرنا آسان ہے، لیکن کسی ایک صاحبِ نظر، لائق اور واقعی پڑھے لکھے شخص کی معرفت حاصل کرنا دشوار ہے۔ میں اس امر میں شائبۂ خوبی تقدیر کا بھی قائل ہوں، وجہ یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کے اثرات، جن کا ادبی ماحول پر اثر پڑا، لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یوں تو آپ کی شخصیت ہمہ جہت ہے، ایک اسلامی مورخ کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، لیکن چونکہ ان معاملات میں میرا علم واجبی واجبی سا ہے، لہٰذا یہ بات تو اہل نظر حضرات کے ذمہ ڈال رہا ہوں اور میں اپنی تحریر کو آپ کے ادبی وتنقیدی مضامین تک محدود کر رہا ہوں۔

یہ میری بدقسمتی ہے۔ اس کا کہاں تک رونا رویا جائے۔ آپ سے تعارف یوں تو تقریباً پچیس تیس سال پہلے ہوا تھا، لیکن تعارف کچھ صحیح انداز اور صحیح شخصیت کے حوالہ سے نہیں ہوا تھا۔ (غالباً کوئی مجتہد نما مجتہد، جن کے متعلق آج بھی میری رائے زیادہ اچھی نہیں ہے اور نہ میں ان کو ادبی شخصیت ہی کے زمرہ میں شامل کرتا ہوں، نے کھیل خراب کر دیا) میں عرصۂ دراز تک آپ کی شخصیت سے محض اسی عذر فہمی کے بنا پر بے بہرہ رہا۔ جو شخص فیض کی کتاب ''نقش فریادی'' کے پرانچے اڑا سکتا ہے، اس کی تنقیدی صلاحیت کا لوہا نہ ماننا کسی سمجھدار آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں یہ مضمون حال میں پڑھ کر آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا، لیکن بقولِ بے خودؔ موہانی (جن کے آپ کسی حد تک مخالف معلوم ہوتے ہیں):

درِ میخانہ کھلا، جب نہ کھلی آنکھ اپنی
اب کھلی آنکھ تو در بند ہے میخانہ کا

معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ آپ کی بینائی نے ساتھ چھوڑ دیا، ورنہ میری دلی تمنا تھی کہ فیض کے سارے کلام پر اس سے زیادہ اچھے انداز سے آپ تنقیدی مضامین لکھ کر فیض کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کرتے۔ خط طویل ہوتا جا رہا ہے۔ سید سبطِ حسن مرحوم اور ایک دوسرے بڑے نامی گرامی کالم نگار، زیادہ عرصہ کی بات نہیں ہے، لکھنؤ میں فیضؔ کے سیمینار میں مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اخباری اطلاع کے بموجب یہ جلسہ لکھنؤ کے رفاہِ عام کلب میں منعقد ہوا تھا۔ وہاں کے کچھ شاعروں نے شکایت کی۔

''دیکھئے! ہم لوگ تو اتنے ادب نواز ہیں کہ انیس کی سرزمین پر فیضؔ کا سیمینار منعقد کرا رہے ہیں، لیکن آج تک پاکستان کے کسی بھی ادبی حلقہ نے لکھنؤ کیا، بلکہ اودھ کے کسی بھی صاحبِ کمال ادیب یا شاعر کی یاد میں ایک جلسہ بھی منعقد نہیں کیا۔'' اس پر کالم نویس صاحب، جن کا آج بھی ملک کے دانشوروں میں بربنائے عہدہ اور سماجی مرتبہ شمار ہوتا ہے، کہنے لگے۔

اگر اہل لکھنؤ ایک فیضؔ سا شاعر بھی پیدا کرتے تو میں دس سیمینار منعقد کراتا۔ اب اس بوالعجبی کا کیا جواب دیا جائے۔ فیضؔ کا مجموعہ تو اب کلیاپ کی شکل میں ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا مطالعہ کر لیجئے، مشکل سے چار فیصدی اشعار ایسے ہوں گے جن میں شعریت پائی جاتی ہے۔ بہر حال آج میں تو یہ جانتا ہوں کہ محسن بھوپالی، رضی اختر شوق، قابل اجمیری، حد یہ ہے کہ رسا چغتائی کی غزلوں کے اشعار، فیضؔ کی غزلوں کے اشعار سے ہزار گنا زیادہ اچھے ہیں۔ ملک کے ممتاز گلوکاروں سے غزلیں گوا کر شہرت حاصل کرنا الگ بات، سچ مچ شعر کہنا دوسرا معاملہ ہے۔ میں نے جان بوجھ کر پاکستان کے ان شاعروں کا ذکر کیا ہے، جو سن وسال، عمر وعہدہ وسماجی رتبہ کے اعتبار سے فیضؔ سے کمتر خیال کئے جاتے ہیں۔ میں نے جوشؔ ملیح آبادی، مجازؔ، پنڈت آنند نرائن ملاؔ، فراقؔ، مجروحؔ سلطانپوری، علی سردار جعفری، کیفیؔ اعظمی اور اس قبیلہ کے شعرا کا ذکر جان بوجھ کر اس لئے نہیں کیا ہے کہ ان سب کا نام لینا میرے خیال میں موخر الذکر حضرات کے ساتھ گستاخی کرنے کے مترادف ہے۔ کاش آپ اب بھی کسی وسیلہ سے تنقیدی مضامین کا سلسلہ جاری رکھئے تو یہ واقعی ادب کی مستحکم خدمت ہوگی! اس تحریر سے میرا

مقصد کسی کی تنقیص یا برائی نہیں، بلکہ حالات کا جائزہ لینا ہے۔

تنقیدی مضامین پر مشتمل کتابیں، حالانکہ ان کی طباعت شایانِ شان طریقہ سے نہیں ہوئی ہے، لیکن مضامین کے لحاظ سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ آپ کا شمار میں جانتا ہوں تنقید نگاروں کے پرانے اسکول سے ہے، لیکن پرانا اسکول نئے تنقید نگاروں کے اسکول کا پیشرو ہے۔ میر مستحسن خلیق کی عظمت اس لئے کم نہ ہوگی کہ وہ انیس سے پہلے تھے آپ کی کتابیں ''لکھنؤ کی تہذیب''، ''تاریخ زبان اردو''، ''لکھنؤ کی زبان''، ''شعور وشاعری'' (جس میں اکیس مضامین شامل ہیں)، ''نگارشاتِ رنگ رنگ''، ''دیوانِ جاوید'' (بندہ کاظم جاوید) اور ''لکھنؤ کی سیاسی''، علمی وادبی اور تمدنی تاریخ اردو زبان میں گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں نے جان بوجھ کر آپ کی ان کتابوں پر جن کے موضوعات اسلامی تاریخ سے متعلق ہیں، نہیں کہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میری کم نگاہی اور کم علمی ہے، دوسری بات اس موضوع پر صرف مذہبی اسکالروں ہی کی رائے محل نظر ہوسکتی ہے، جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میں نے، حقیقت یہ ہے کہ، یہ خطرات کو خرابیِ صحت کے باوجود قلمبر داشتہ، دلی تاثرات قلمبند کرنے کی خاطر تحریر کیا ہے۔ اگر صحت نے اجازت دی تو انشاء اللہ! پھر تفصیلی گفتگو ہوگی۔



(۳) حضرت شمسؔ کی اصلاحیں

جناب اختیار حسین دل شمسؔ آبادی (ایڈوکیٹ)

مولانا محمد باقر شمسؔ کی ذات اپنے صفات کے ساتھ مجموعۂ کمالات ہے۔ ان کی عمر پچاسی سال کی ہے، مگر دماغ حاضر، حافظ قوی اور فکر جوان ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے ماہر اور علم دین کے خاندانی وارث اور علمِ تاریخ کے بحرِ زخار ہیں۔ بصارت کے ضعف کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہیں، مگر بڑے بڑے مضامین املا کروا دیتے ہیں۔

ادب میں علم لسانیات کے نئے قاعدوں کے واضع اور پرانے قاعدوں کے ناسخ ہیں۔ نقدِ سخن میں اپنا مثل نہیں رکھتے۔ شعر سنتے ہی اس کے عیب پر نظر جاتی ہے اور لفظی تبدیلی سے اس کو صحیح و بلند کر دیتے ہیں۔

قدیم اساتذہ اور اپنے عہد تک کا کوئی شاعر ان کا ہدف بننے سے محفوظ نہیں رہا۔ ان کا نقد و تبصرہ اہل فن پر سخن فہمی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور ادبِ اردو کا گرانقدر سرمایہ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

میر کے شعر پر نقد و اصلاح ملاحظہ فرمائیے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہ ایک مشفق ماں کی زبان ہے جو اپنے ننھے منے بچے کے لئے کہہ رہی ہے۔ اس کوسن کے سوداؔ نے کہا تھا کہ ان کی ماں نے کہا ہوگا۔ اس شعر کو یوں درست کیا ہے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
شبِ فرقت کا جاگا سو گیا ہے

یا

لحد پر میر کی آہستہ چلیے
شبِ فرقت کا جاگا سو گیا ہے

سوداؔ کا مشہور شعر ہے:

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے، سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس پر اعتراض یہ کیا ہے کہ ''کیفیتِ چشم یاد ہے'' کے معنی ہیں کہ جب سے دیکھی ہے، اس وقت سے اب تک یاد ہے تو اب کیا خاص بات پیدا ہوگئی، جو غش آنے لگا۔ شعر یوں ہونا چاہیئے:

وہ مست نگاہیں مجھے یاد آگئیں، سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

''کیفیتِ چشم'' کے مقابلہ میں ''مست نگاہوں'' میں جو جادو بھرا ہے، اس کی تعریف نہیں ہوسکتی اور ''یاد آگئیں'' کا مصرع اس کا محتاج تھا۔ اب شعر معراج کی بلندی تک پہنچ گیا۔

غالبؔ کا شعر ہے:

تماشا کر، اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

''تماشا'' فارسی میں کھیل اور دیکھنے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اردو میں شعرا نے بھی انھیں دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے، مگر نثر اور بول چال میں صرف کھیل کے معنوں میں مستعمل ہے، اس وجہ سے ان معنوں سے ہمارا ذہن زیادہ مانوس ہے۔ غالبؔ کے شعر میں ''تماشا کر'' فارسی کے ''تماشا کن'' کو بھونڈا، خلافِ محاورہ ترجمہ اور کھیل کے معنوں سے زیادہ قریب ہے۔ مصرع یوں درست ہوسکتا ہے:

ادھر اک نظر، محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

میر انیسؔ کا شعر ہے:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں، ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

ضعف سے کام لینا منشائے بلاغت کے خلاف ہے، دست بلیغ ہے۔ شعر یوں ہونا چاہیئے۔

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں دستِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

داغؔ کا شعر ہے:

میں کلمہ گو ہوں خاص خدا و رسول کا
آتا ہے بامِ عرش سے مژدہ قبول کا

''کلمہ'' عقیدہ ہے جس کا اردو قبول سے کوئی تعلق نہیں۔ شعر یوں ہونا چاہیئے:

مداح ہوں میں خاص خدا و رسول کا
آتا ہے بامِ عرش سے مژدہ قبول کا

مرزا محمد ہادی، معروف بہ رسواؔ، کا شعر ہے:

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

عشق کو شعرا نے نور کہا ہے، جس سے صفائے باطن اور جلائے قلب پیدا ہوتی ہے۔ جس عشق کی لذت معصیت ہے، وہ قبیح ہے اور غزل کا مضمون نہیں۔ شعر یوں ہونا چاہیئے:

لذتِ عشقِ بتاں کو مت پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

مرزا محمد ہادی عزیزؔ کا شعر ہے:

لذتِ درد رہی بعدِ فنا بھی دل میں
حصۂ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا

''حصہ'' کو ''عرصہ'' میں بدل کے شعر کو بلند کردیا، یعنی:

لذتِ درد رہی بعدِ فنا بھی دل میں
عرصۂ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا

مرزا کاظم حسین محشرؔ کے قصیدہ کا مطلع ہے:

ادھر سے شیخ ادھر سے برہمن لینے قدم نکلے
نہ جانے آج بطنِ کعبہ سے کیا لے کے ہم نکلے

اعتراض: ''شیخ'' کی لفظ بے محل ہے، اس کو تو قدم لینا ہی چاہیئے تھا۔ برہمن لینے نکلا، یہ تعجب کی بات ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی شخص ہونا چاہیئے، جس کو برہمن کی طرح قدم نہ لینا چاہیئے۔ دوسرے مصرع میں ''ہم نکلے'' مہمل ہے۔ بنتِ اسد نکلی یا ابوطالب نکلے یا رسولؐ نکلے اگر ہوتا تو ایک بات تھی، ''ہم نکلے'' مہمل ہے۔ شعر یوں ہونا چاہیئے:

ادھر سے گبر، ادھر سے برہمن لینے قدم نکلے
حرم سے آج کیا لے کے رسول محترمؐ نکلے

علامہ اقبال کا یہ شعر ترتیب و بندش کے لحاظ سے مبتدیانہ اور معنی کے لحاظ سے غلط ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

قصرِ سلطانی کا گنبد تیرے نشیمن کی جگہ نہیں، یعنی مقامِ عیش و عشرت میں رہنا تجھے مناسب نہیں۔ اس مطلب کے ادا

کرنے میں پہلی غلطی یہ ہوئی کہ گنبد پر جھونجھ نہیں لگایا جاسکتا، پھر قصرِ سلطانی کے گنبد پر جھونجھ کتنی بے تکی بات ہے! یہ اس وقت ممکن ہے، جب وہ قصرِ شاہی کبھی رہا ہو۔ اب ویران وشکستہ ہو، گنبد میں دراڑیں پڑگئیں ہوں اور چڑیوں نے جھونجھ لگالیا ہو تو وہ مکانِ عیش نہیں، ویرانہ ہے اور اس کی یہ حالت مفید مطلب اور مقصودِ شاعر نہیں۔ اس کو یوں ہونا چاہیئے۔

نہیں زیبا ہے تجھ کو شاخِ گل پر آشیاں بندی
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

چٹانوں میں بھی غلط ہے، مگر ردیف کی مجبوری شاید جواز پیدا کردے

فانی بدایونی کا شعر ہے:

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں، صیاد!

گرفتارِ قفس بلبل صیاد سے کہہ رہی ہے کہ اس نے اس کی خوش الحانی کی وجہ سے اس کو گرفتار کیا۔ یہ بات اپنے دل یا ہم قفس سے کہنے کی ہے، صیاد تو جانتا ہی ہے۔ یہ عیب ردیف سے پیدا ہوا۔ شعر یوں ہونا چاہیئے تھا:

ستم رسیدۂ آوازۂ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں مجھ کو

مگر اس سے بھی شعر درست نہیں ہوا۔ پہلے مصرع میں خوش الحانی کو ''آوازہ'' اور دوسرے مصرع میں ''زبان'' کہا ہے۔ آوازہ اور زبان تمام جانوروں میں مشترک ہے گدھا اور کوا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ یہ کلام کا بڑا نقص ہے کہ کسی مخصوص صفتِ کمال کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں تعمیم پیدا ہو کے اس کی اہمیت ختم ہوجائے۔ یہ صحیح ہے کہ بلبل کے ساتھ ''آواز'' کا ذکر خوش الحانی کا اور گدھے کے ساتھ کراہتِ صوت کا قرینہ ہے، مگر اس شعر میں یہ قرینہ بھی نہیں۔ صرف ''آوازۂ بیاباں'' سے اگر آپ بلبل سمجھیں تو یہ آپ کا حسنِ ظن ہوگا کہ شاعر یہی کہنا چاہتا ہے الفاظ سے یہ معنی پیدا نہیں ہوتے۔ بلبل بیاباں میں نہیں، باغ میں شاخِ گل پر خوشبو سے مست ہو کے چہکتا ہے۔ بیاباں میں الو بولتا ہے۔ قرینہ اس مطلب پر دلالت کرتا ہے کہ صیاد سے الو کہہ رہا ہے کہ اس نے اس کے بولنے سے اس کو پہچان لیا اور گرفتار کرلیا اور اس کے لئے ''آوازہ'' ہی کہنا مناسب تھا۔ الفاظ اور قرنیہ سب اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ ''الو'' سمجھا جائے، مگر یہ شاعر کے کہنے کی بات نہیں اس نے یقیناً ''بلبل'' کہنا چاہا ہے۔ یہ زبان وبیان کا بڑا نقص ہے کہ کہنا چاہا ''بلبل'' اور کہہ گیا ''الو''۔ اگر ''آوازۂ بیاباں'' کی جگہ ''آوازۂ گلستاں'' ہوتا تو یہ نقص پیدا نہ ہوتا، مگر شاعر جو کہنا چاہتا ہے، وہ اس سے بھی ادا نہیں ہوتا۔ بلبل کا اپنی نواسنجی کو ''آوازہ'' کہنا منشائے بلاغت کے خلاف ہے۔ اس کو یوں کہنا چاہیئے:

ستم رسیدۂ اعجازِ نغمہ سنجی ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں، صیاد!

مگر اس میں بھی ''صیاد'' اور ''زبان'' کی لفظ باقی رہتی ہے۔ اگر ردیف وقافیہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو اس مفہوم کو یوں ادا ہونا چاہیئے۔:

ستم رسیدۂ اعجاز نغمہ سنجی ہوں
قفس میں کھینچ کے لایا مرا کمال مجھے

اصغر گونڈوی کا شعر ہے:

اس سے زیادہ اور کیا شوخیِ نقشِ پا کہوں
بجلی سی اک چمک گئی میرے سرِ نیاز میں

اس شعر میں مولانا کا یہ لطیف اعتراض اور اس کی اصلاح ملاحظہ فرمایئے:

''بجلی آنکھ میں چمکتی ہے سر میں نہیں۔''

اگر شاعر کوئی بات خلافِ واقعہ یا خلافِ عقل کہتا ہے تو اس کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ سر میں بجلی چمکنا خلافِ واقعہ بھی ہے اور خلافِ عقل بھی ہے۔ چمک کا تعلق آنکھ سے ہے۔ سر میں بجلی چمکنا غلط ہے۔ شعر یوں درست ہوسکتا ہے:

اس سے زیادہ اور کیا شوخیِ کفشِ پا کہوں
بجلی سی اک چمک گئی میرے سرِ نیاز میں

جگرؔ کا شعر ہے:

ہجوم تجلی سے معمور ہوکر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہوکر

پہلے مصرع میں ''ہجوم تجلی'' غلط ہے۔ ہجوم کے لئے جمع کا ہونا ضروری ہے۔ افکار کا ہجوم، مسرتوں کا ہجوم کہتے ہیں۔ واحد کے لئے ہجوم نہیں کہتے۔ گھر میں روشنی کا ہجوم، دریا میں پانی کا ہجوم غلط ہے۔ اس کے لئے شدت ووفور کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اگر ''ہجوم'' کی جگہ ''وفور'' ہوتا تو صحیح ہوتا۔ دوسرے مصرع میں نظر کے شعلہ بن جانے کا کوئی مفہوم نہیں۔ کسی چیز کا شعلہ بن جانا کنایہ ہے، اس کے جل جانے سے جس کی دلالت ہے۔ فنا ہوجانا، نگاہ کے شعلہ بن جانے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ نگاہ جل گئی اور بصارت زائل ہوگئی۔ ہاں! شاعری میں دل اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ جل کے زندۂ جاوید ہوجاتا ہے۔ اگر اس کو شعلۂ طور کہا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ صفائے باطن بڑھ گئی، بصیرت زیادہ ہوگئی اور کمالِ معرفت حاصل ہوگیا۔ جگرؔ صاحب نظر کے شعلۂ طور بن جانے سے کیا کہنا چاہتے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے مجموعہ کی مناسبت سے ایک شعر لکھنے کو جی چاہا، وہ کہہ دیا۔ مجموعہ کا نام ''شعلۂ طور'' شعر میں آگیا، کام پورا ہوگیا۔

یہ اصلاحیں شمسؔ صاحب کی کتاب ''شعور وشاعری'' اور دوسرے مضامین سے نقل کی گئی ہیں، جن سے تصرفِ الفاظ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، شاعری کی گتھیاں سلجھتی ہیں، سخن فہمی کے گر معلوم ہوتے ہیں، اہل ذوق کے لئے شعر کے معائب ومحاسن معلوم ہوتے ہیں اور سخن فہمی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بلا شبہ اہل ذوق کے لئے خضرِ راہ اور مشعلِ راہ ہیں۔



مباہلہ

ندیؔ الہندی

دو جواں اک پیر اور دو ساتھ بچے آگئے
اہل نجراں آؤ دیکھو لوگ اچھے آگئے
اس لئے باطل نے خود ہی ہار اپنی مان لی
جتنے سچ میں بچوں میں تھے سب سے سچے آگئے



ہیں نصاریٰ کے مقابل باحشم گنتی کے پانچ
خود کو لے کر آج ہیں شاہ امم گنتی کے پانچ
ان سے بہتر صفحۂ گیتی پہ سچے ہی نہیں
آگئے میدان میں ہوکر بہم گنتی کے پانچ
کثرتِ اعدا کو عزمِ پنجتنؑ کا ہے پیام
جھوٹ سے لڑنے کو بس کافی ہیں ہم گنتی کے پانچ



وہ مسیحیوں سے مباہلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہمیں یاد سب ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
معِ ہر دو نواسگانِ خود معِ مرتضیٰ معِ فاطمہؑ
وہ نکلنا گھر سے رسولؐ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
تھے جو رہنمائے مسیحیاں نظر آیا ان کو عجب سماں
جو تھے بھولے یاد سب آگیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو کل تلک تھے بھرے بھرے نظر آرہے ہیں بھلے بھلے
وہ شکست خود ہی سے ماننا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سرِ پُرغرور جھکے ہوئے جو تے ہر مسیحیٔ وقت کے
تھا ثبوتِ عظمتِ مصطفےٰؐ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہے ندیؔ کی شاعری عشق کی ہے ندیٰ کی شاعری فکر کی
اُسے یاد اپنا سخن رہا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

